© rasailojaraid.com

تاثرات

کولن برامکوف

بخارا و سمرقند کی ایک جھلک

["دی کرسچن سائنس مانیٹر" نے اپنی ایک اشاعت میں ازبکستان کے شہروں — بخارا اور تاشقند — کے حوالے سے سیاحت کے شوقین امریکیوں کے لیے ایک مضمون لکھا ہے جس کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

مضمون کے ساتھ یہ اطلاع دی گئی ہے کہ "موسم خزاں وسطی ایشیا کے سفر کے لیے موزوں ترین وقت ہے، کیوں کہ ان دنوں میں درجہ حرارت معتدل اور جہازوں کے کرایے کم ہوتے ہیں۔ موسم گرما ناخوشگوار حد تک شدید ہوتا ہے۔ مغربی معیار پیشِ نظر ہے تو سابق سوویت یونین کا سفر زیادہ آرام دہ نہیں ہے۔ ہوٹل "۲۔ سٹار" درجے کے ہیں جن میں پرائیویٹ غسل خانے کی سہولت فراہم ہوتی ہے۔ بڑے ہوٹلوں میں پونڈ اور ڈالر میں کاروبار کرنے والے اسٹور غیر ملکی اشیاء فروخت کرتے ہیں۔ مغرب کے ساتھ ٹیلی فون اور فیکس کا رابطہ کہیں کہیں ہے اور مہنگا ہے البتہ ٹیلیکس کا نظام درست ہے۔

مقامی دکانوں سے اعلیٰ کوالٹی کی اشیائے صرف بہت کم ملتی ہیں، اس لیے کیمرے کے لوازم یعنی فلمیں اور بیٹریاں وغیرہ ساتھ لے جانا ضروری ہیں۔ مغربی دنیا کے چاکلیٹ، خوشبویات، خوبصورتی سے ڈبوں میں بند کی ہوئی اشیاء میزبانوں کے لیے موزوں تحفہ ثابت ہوسکتی ہیں۔ سیاحوں کو اکثر اشیاء کے لیے پونڈ یا ڈالر میں ادائیگی کرنی ہوتی ہے۔ چھوٹے نوٹوں کی شکل میں کرنسی ساتھ ہونی چاہیے۔ ٹریولرز چیک اور کریڈٹ کارڈ کام نہیں دیتے---"

مضمون ایک "سیاح" کے تاثرات اور مشاہدات پر مبنی ہے۔ ضروری نہیں کہ جن تجربات سے مضمون نگار گزرا ہے، ہر ایک کو ان سے واسطہ پڑے تاہم اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے "مہم جُو" سابق سوویت یونین کی ریاستوں میں جارہے ہیں اور ان کی رہنمائی کے لیے رسائل وجرائد کس قسم کے معلوماتی مضامین اور رپورٹیں شائع کررہے ہیں۔ مدیر]

"پرانے شہر میں رات کے وقت مت گھومنا۔ وہ خیال کریں گے کہ تو روسی ہے اور تجھے پکڑنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی کوشش کی جائے گی۔"

پولیس مین کی یہ تنبیہ مجھ پر بے اثر رہی۔ قدیم بخارا کی عمارتوں کے حسن سے مسحور، جن کے مینار ڈوبتے سورج کی کرنوں میں چمک رہے تھے، میں تاریکی چھا جانے کے کافی دیر بعد تک وہاں ٹھہرا رہا۔ سپاٹ چہروں اور چمکتی آنکھوں والے تاجک نوجوان کبھی کبھی میری جانب آتے تھے مگر میرے اندر کسی خطرے کا احساس نہ تھا۔

رات سرد ہو چکی تھی اور جب میں واپس رہائش گاہ جانے کے لیے مڑا تو اس احساس سے سخت دھچکا لگا کہ میں راستہ بھول چکا ہوں۔ اندھیرے میں نادیدہ لوگوں کا لعن طعن سنتا کافی دیر تک تاریک اور تنگ گلیوں میں بھٹکتا رہا۔ ایک سایہ خطرناک انداز میں میری طرف بڑھا مگر دور فاصلے پر کھڑے پولیس مین نے مجھے بچا لیا کیوں کہ بڑھتے ہوئے اس "سائے" کو تاروں کی روشنی میں پولیس مین کی چمکتی ہوئی پیٹی نظر آ گئی تھی۔

سابق سوویت یونین کی جنوبی جمہوریاؤں میں آزادی کے بعد روس مخالف جذبات میں شدّت پیدا ہوئی ہے اور بہت سے روسی وسطی ایشیا چھوڑ چکے ہیں۔ پرانے شہروں کی تنگ گلیاں، جو از حد گنجان آباد ہیں اور ان کے مختلف النسل باسی طویل عرصے تک روس نواز کمیونسٹوں کے جبر کا نشانہ رہے ہیں، سب سے زیادہ خطرناک جگہیں ہیں۔ بخارا اور ازبکستان کے دیگر شہروں میں نسلی رنگا رنگی صدیوں پر محیط سلطنت کی الجھی ہوئی باقیات ہیں۔ مقامی ازبک آبادی، تاجکوں، ترکوں اور تاتاروں کے ساتھ خلط ملط ہو کر رہ گئی ہے۔ اسٹالن نے ہزارہا اقلیتی گروہوں کو پورے سوویت یونین میں اس لیے جبراً پھیلا دیا تھا تاکہ کہیں بھی کوئی ہم آہنگ نسلی گروہ ماسکو کے خلاف بغاوت نہ کر سکے۔

بدامنی کے باوجود بخارا اب بھی مساجد اور چائے خانوں کا ایک سحر انگیز امتزاج پیش کرتا ہے۔ بڑے بوڑھے بید کے پرانے درختوں کے نیچے شطرنج کھیلتے اور تانبے کی کیتلیوں میں چائے پیتے نظر آتے ہیں۔ بچے تالابوں کے گرد دوڑتے اور درختوں پر چڑھ چڑھ کر پانی میں چھلانگیں لگاتے ہیں۔ پانی میں چھپاک چھپاک کی آواز کے ساتھ جو ایک نئی آواز شامل ہوتی ہے، یہ موذن کی آواز ہے جس کے "اللہ اکبر" کے الفاظ اہل ایمان کو خدا کے حضور جھکنے کے لیے بلاتے ہیں۔

بخارا ترکمنستان کے دُور دور تک پھیلے ہوئے تصور زدہ صحرا کے کنارے آباد ہے جہاں بمشکل ہی کوئی روئیدگی ہوتی ہے اور آبادی خال خال ہے۔ اگر مزید جنوب کی طرف ترکمنستان کی طرف مہم جوئی کی جائے جو سابق سوویت یونین کی آخری جنوبی جمہوریہ ہے تو کسی بڑی آبادی کو دیکھے بغیر ایران پہنچا جا سکتا ہے۔

میں کاٹن فیکٹری کے ایک ازبک مزدور، شہزاد کے ہاں ٹھہرا تھا جس کی رہائش سوویت طرز کے کنکریٹ بلاک کے ایک حصے میں ہے۔ شہزاد نے مجھے اپنے ہاں قیام کی دعوت دی تھی۔ وہ ایک دن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مجھے اپنی فیکٹری دکھانے لے گیا۔ فیکٹری کے باہر ایک بہت بڑے شیڈ میں گندی کپاس کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور چار دیواری کے اندر سیکڑوں خواتین بھڑکیلے اور شوخ کپڑوں میں ملبوس مشینوں پر کام کرنے اور تیار شدہ مصنوعات کو ڈبوں میں بند کرنے میں مصروف تھیں۔ شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہر لحاظ سے یہ ایک سوویت فیکٹری تھی اور اس بات کا واضح اظہار تھی کہ آزادی کے بعد بھی یہاں کوئی خاص تبدیلی وقوع پذیر نہیں ہوئی۔

جمہوریہ ازبکستان میں کپاس کی بے تحاشا پیداوار سے شمال میں سنگین ماحولیاتی مسائل پیدا ہو گئے ہیں کیوں کہ کپاس کے لیے ۵۰ لاکھ ایکڑ کی نئی زمین کی وجہ سے دریا خشک ہو گئے ہیں۔

شہزاد کو صرف دو ہزار روبل یعنی ۱۷ ڈالر ماہانہ تنخواہ ملتی ہے اگرچہ وہ اعلیٰ صلاحیت کا مالک اور تجربہ کار شخص ہے۔ اُس کی بیوی منیرہ ایک اعلیٰ انگریزی اسکول میں انگریزی زبان پڑھاتی ہے اور وہ مزید تین ہزار روبل یعنی ساڑھے ۲۵ ڈالر کما لاتی ہے لیکن نئی حکومت اشیائے ضرورت کی قیمتیں کم رکھنے کے لیے دی جانے والی امداد ختم کر رہی ہے اور اس سے افراطِ زر میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔

جون ۱۹۹۲ء کی قیمتوں کے مطابق کافی کے ایک جار کی قیمت ایک ہفتے کی تنخواہ کے مساوی تھی جب کہ ایک نئی قمیص خریدنے پر پورے مہینے کی تنخواہ اٹھ جاتی تھی۔ شہزاد کو اپنے کام پر جانے کے لیے ۲۰ میل کے سفر پر گیس کے لیے اگر رقم ادا کرنی پڑتی تو وہ ایک روز کی تنخواہ کے برابر ہوتی، مگر سابق سوویت شہریوں کی طرح اس کے بھی "مراسم" ہیں اور اسے گیس سستی مل جاتی ہے۔

منیرہ کے لیے زندگی اس سے زیادہ مشکل ہے۔ پورا وقت پڑھانے کے ساتھ اسے گھر کا کام کاج کرنا پڑتا ہے۔ ہر شام وہ اپنے ہاتھ سے کپڑے دھوتی، انہیں استری کرتی اور گھر کی صفائی کرتی ہے۔ گھر میں جو کچھ مل جاتا ہے، اس سے کھانا پکاتی ہے۔ روٹی خود تیار کرتی ہے اور اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے محض وہ چھوٹا سا پرندہ ہے جو اس نے پال رکھا ہے۔

منیرہ کا ذہن اپنے بچے کی تعلیم کے اخراجات کے لیے پریشان رہتا ہے۔ یوں تو یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ تعلیم کے جملہ اخراجات مہیا کرے لیکن اس نے بتایا کہ اچھے اسکولوں میں داخلے کے خواہش مند طلبہ کی تعداد ہزاروں میں ہے اور انتظامیہ کسی بچے کے داخلے کے لیے ہزاروں روبل رشوت لیتی ہے۔ بخارا کے ازبکوں کے ساتھ ایک ہفتے کا قیام ایک غم ناک تجربہ تھا۔

وسطی ایشیا میں صرف ایک شہر بخارا سے قدیم تر ہے اور وہ سمرقند ہے۔ اس کی بنیاد چوتھی صدی عیسوی میں رکھی گئی تھی۔ سمرقند پر یکے بعد دیگرے کئی قوموں کا قبضہ ہوا۔ اسکندر اعظم کی سرکردگی میں یونانیوں، پھر ترکوں، عربوں اور چنگیز خان کے منگول قبائل نے اپنا ناقوس بجایا۔ ۱۴ویں صدی کے فاتح تیمور لنگ نے اسے اپنا دارالحکومت بنایا اور اس پر خوب دولت نچھاور کی۔ آج بھی تیمور لنگ گورِ امیر کے فیروزی اور سنہرے مقبرے میں مدفون سمرقند میں موجود ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سمرقند برصغیر اور چین کی تجارتی قدیم شاہراہ ریشم پر واقع ہونے کی وجہ سے ایک اہم تجارتی مرکز رہا ہے۔ جب روسیوں نے ۱۸۶۸ء میں اس پر قبضہ کیا تو انھوں نے شکست و ریخت سے دوچار نازک بیل بوٹوں سے مزیّن ٹائلوں والی عمارتوں، مدرسوں اور مسجدوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی جو اس شہر کی اہمیت اور تیمور لنگ کی طاقت کی مظہر تھیں۔

کمیونزم کے ستر سالہ دور میں یہ شہر باہر کی دنیا سے بالکل کٹا رہا۔ اس کے مکین صرف وہی کچھ جانتے ہیں جو ماسکو نے انہیں سکھایا ہے۔ مجھے اکا دکا لوگ ہی ایسے ملے ہیں جو انگریزی بول سکتے تھے۔ مغربی اخبارات حتیٰ کہ کوکا کولا بھی یہاں تعیّشات میں شامل ہے اور یہاں کے کاروباری مرکز ان سے ناواقف ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے علاقے کی سیاحت کس لیے؟ [جواباً عرض ہے کہ] نہایت مختصر وقت میں ایک ایسے معاشرے نے جسے طویل عرصے تک بیرونی دُنیا سے منقطع رکھا گیا، اپنے آپ کو دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ وسطی ایشیا میں نسلی گروہوں کا اختلاط بلاشبہ تبدیلیاں لائے گا لیکن اس وقت پرانی سوویت ثقافت کا ہر پہلو سیاحوں کے لیے بے نقاب ہے۔

سوویت ریلویز ازبکستان کے دارالحکومت تاشقند کے لیے بخارا سے ۱۷۰ میل پٹڑی پر سست ترین رفتار سے چلنے والی گاڑیاں چلاتی ہے۔ ازکار رفتہ اور پرانے ڈبوں میں نو گھنٹے کا پُرہنگام سفر ہندوستانی ٹرینوں کے کاہل ترین نظام سے بھی بدتر ہے۔ مجھے ٹکٹ حاصل کرنے میں کئی گھنٹے لگ گئے۔ گندم گوں ازبک مزدوروں کی سخت دھکم پیل کے باوجود میں کھڑکی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا مگر ٹکٹ فروش لڑکی بالکل سوویت انداز کے مطابق ٹیلی فون پر اپنی کسی دوست کے ساتھ گپ بازی میں مصروف تھی۔ جب اُس نے ریسیور رکھا تو ساتھ ہی "وقفہ" کہہ کر کھڑکی کا پٹ نیچے گرا دیا۔ سوویت افسر شاہی کا رویّہ انسانی جذبات سے عاری اور اٹل تحکم پر مبنی ہوتا ہے اس لیے ایسے مواقع پر تکرار یا بحث مباحثہ کا خیال بھی دم توڑ دیتا ہے۔

جب میں خیریت سے ٹرین میں سوار ہو گیا تو ازبک مہمان نوازی غالب آ گئی۔ اپنی غربت کے باوجود میرے ہم سفروں نے مجھے اپنی نشستیں، اپنے تُرش نان اور خوشبودار چائے پیش کی۔ ہر ڈبے میں سماوار اُبل رہے تھے اور باقی ماندہ سفر کے لیے ہمارے پاس کھانے پینے کا کافی سامان تھا۔

ٹرین کا رخ جیسے ہی مشرق کی جانب ہوا، ماحول تبدیل ہونے لگا۔ گھاس پتھر کی طرح سخت زمین کا سینہ چیر کر باہر آ گئی تھی اور آلو کے پودے ہواؤں کے تھپیڑوں کے سامنے بہادری سے کھڑے لہلہا رہے تھے۔ کپاس کے پودے اور پھل دار درخت بھی نظر آنے لگے تھے اور جوں جوں ہم تاشقند اور جدید زندگی کے قریب ہونے لگے، دور پہاڑوں سے آنے والی ہوائیں ہماری مشامِ جان کو تازہ کرنے لگیں۔

("دی کرسچن سائنس مانیٹر" - ۸ ستمبر ۱۹۹۲ء)

© rasailojaraid.com